⊙ احمد عبداللہ

پی ایچ ڈی اسکالر، شعبہ اردو، سرگودھا یونیورسٹی، سرگودھا

⊙⊙ ڈاکٹر غلام عباس گوندل

ایسوسی ایٹ پروفیسر، شعبہ اردو، سرگودھا یونیورسٹی (میانوالی کیمپس)، سرگودھا

سبطِ حسن اور ثقافت کے مباحث

Abstract:

Sibt e Hasan is a prominent scholar and important cultural critic of Pakistan.. He is follower of Marxist theory of social structure and its development through various ages. A debate of culture and Pakistani culture was very significant in the post independence era. This debate has three major dimensions: fundamental Islamic culture, Indo Muslim culture and progressive approach towards culture. As being a marxsist he always remained hard liner and studied the Pakistani culture with progressive approach. Hence he is close to Sajjad Zaheer and Mumtaz Hussain instead of Faiz Ahmad Faiz and Ahmad Nadeem Qasmi, It is his major contribution that he studied the culture of Pakistan in the light of history and societal development. His book "Pakistan mein Tahzeeb ka Irtiqa" is a comprehensive ducument on this topic. The following article is an endeavour to cover Sibt e Hassan's cultural thoughts.

Keywords:

Culture, Language, Sibt e Hasan, Civilization, Marxist

قیامِ پاکستان کے بعد ثقافت کے حوالے سے ہونے مباحث میں سبطِ حسن ایک اہم نام ہے۔ سبط حسن ایک ترقی پسند دانش ور تھے۔ اردو میں انھوں نے کلچر کے ترقی پسندانہ تصورتہذیب وثقافت کے موضوع پر مسلسل اور تحقیقی نوعیت کا کام کیا۔ انھوں نے اس موضوع پر پاکستان میں تہذیب کا ارتقا اور موسیٰ سے مارکس تک جیسی

معتبر کتابیں لکھیں۔اس کے علاوہ متعدد مضامین میں ثقافت اور ثقافت پاکستان کو ترقی پسند نقطہ نظر سے موضوع بحث بنایا۔ وہ تہذیب و ثقافت کے حوالے سے لکھتے ہیں:

> ''انگریزی زبان میں تہذیب کے لیے کلچر کی اصطلاح استعمال ہوتی ہے۔کلچر لاطینی لفظ ہے اس کے لغوی معنی ہیں ''زراعت، شہد کی مکھیوں، ریشم کے کیڑوں، سیپوں اور بیکٹیریا کی پرورش یا افزائش کرنا۔جسمانی یا ذہنی اصلاح و ترقی، کھیتی باڑی کرنا''، اردو، فارسی اور عربی میں کلچر کے لیے تہذیب کا لفظ استعمال ہوتا ہے۔تہذیب عربی زبان کا لفظ ہے اس کے لغوی معنی ہیں کسی درخت یا پودے کو کاٹنا چھانٹنا، تراشنا تا کہ اس میں نئی شاخیں نکلیں اور نئی کونپلیں پھوٹیں۔فارسی میں تہذیب کے معنی ''آراستن پیراستن، پاک و درست کردن اور اصلاح نمودن'' ہیں۔اردو میں تہذیب کا لفظ عام طور پر شائستگی کے معنی میں استعمال ہوتا ہے۔''(۱)

سبطِ حسن تہذیب کو انسان کی ہم سفر قرار دیتے ہیں البتہ ان کے خیال میں تمدن اس وقت وجود میں آیا جب شہر آباد ہوئے۔ان کے خیال میں تہذیب اور انسان کا ساتھ اتنا ہی پرانا ہے جتنا خود انسان۔اپنے مضمون 'تہذیب سے تمدن تک' میں لکھتے ہیں:

> ''تہذیب کے آثار ہر معاشرے میں ملتے ہیں خواہ وہ غاروں میں رہنے والے نیم وحشی قبیلوں کا معاشرہ ہو یا صحراؤں میں مارے مارے پھرنے والے خانہ بدوشوں کا معاشرہ ہو۔چنانچہ تہذیب اس زمانے میں بھی موجود تھی جب انسان پتھر کے آلات و اوزار استعمال کرتا تھا اور جنگلی پھلوں، اور جنگلی جانوروں کے شکار پر زندگی بسر کرتا تھا۔سپین اور فرانس کے غاروں کی رنگین تصویریں اور مجسمے اب سے چالیس پچاس ہزار برس پیشتر کے انسان کے حسن عمل اور علم حسن کا نادر نمونہ ہیں۔''(۲)

تاریخ انسانی میں پہلے ہر جگہ ابتدائی ثقافتوں نے جنم لیا جنھوں نے چھوٹے انسانی گروہوں (قبائلی برادریوں) کے رویے اور سرگرمی کے نمونے تیار کیے ہے ثقافتیں انتہائی پائیدار اور تقریباً غیر متغیر تھیں۔ابتدائی ثقافتیں تشکیل دینے والے ہے ابتدائی انسان جو قبائلی زندگی کے حامل تھے ثقافت کے تانے بانے میں شاذ ہی مداخلت کرتے تھے اس کی وجہ ایک تو ہے تھی کہ انسان ابھی عقل کے اعتبار سے بہت پر اعتماد نہیں ہوا تھا اس لیے وہ اسے مداخلت بے جا تصور کرتا تھا اور دوسری بات ہے کہ قبائلی نظام کی گرفت ہمیشہ سے مضبوط رہی ہے جس میں روگردانی یا سرمو انحراف کی گنجائش نہیں نکلتی تھی۔اس کا مشاہدہ ہم ان علاقوں میں انسانی تہذیب کے مطالعے سے کر سکتے ہیں جہاں آج بھی قبائلی نظام موجود ہے اور اب تو اس کی گرفت کافی کمزور پڑ چکی ہے تو جب کمزور گرفت کے ساتھ ہے اتنی اہلیت کا حاصل ہے تو سوچیے جب اس کی گرفت بہت مضبوط تھی تب تو قبیلے کی ثقافت قبائلی کو اپنی سرشت محسوس ہوتی ہوگی۔اس لیے ابتدائی ثقافتی و تہذیبی نقوش نہ صرف دیر تک روبہ عمل رہے بلکہ وہ جاری و ساری تہذیبوں میں ابھی تک اپنی جھلک قائم رکھے ہوئے ہیں اسی کو تہذیبی تسلسل کہتے ہیں۔

انسانی ثقافت کے بڑے ادوار:

علمائے تہذیب نے انسانی تہذیب کے اعتبار سے جو ادوار مقرر کیے ہیں، سبط حسن انھی کو ثقافتی ادوار کہتے

ہیں۔علما نے تہذیب انسانی کومختلف ادوار میں تقسیم کیا ہے۔تاہم یہ تقسیم مختلف زاویے سے تہذیب کو دیکھنے کے باعث ہے۔فریڈرک اینگلز(Friedrich Engels) کی کتاب (Origin of the family,private property and the state) جس کا اردو ترجمہ خاندان، ذاتی ملکیت اور ریاست کا آغاز کے نام سے ہوا، میں اسے تین بڑے ادوار میں تقسیم کیا گیا ہے:

۱۔ عہدِ وحشت:(Savagery)

جس میں انسان قدرت کے خزانے سے زیادہ تر وہی چیزیں لیتا تھا جو کھانے پینے کے لیے تیار ملتی تھیں۔انسان خود زیادہ تر ایسے اوزار تیار کرتا تھا جن سے ان چیزوں کو لینے میں آسانی ہو۔

۲۔ عہد بربریت:(Barbarism)

جس میں انسان نے مویشی پالنا اور کھیتی کرنا یعنی اپنی محنت سے قدرت کی زرخیزی کو بڑھانے کا طریقہ سیکھا۔

۳۔ تہذیب کا عہد:(Civilization)

جس میں انسان نے قدرت کی نعمتوں سے مزید کام لینا سیکھا اور صنعت وحرفت اور فنون کی واقفیت حاصل کی۔(۳)

یہ تقسیم انسانی معاشرت کی ادوار بندی کرتی ہے۔یہ بات محل غور ہے کہ عہد وحشت کو تہذیب میں شمار نہیں کیا گیا جب کہ اس کی ذہنی صلاحیتیں استعمال میں آ کر اسے زندگی کو سہل کرنا سکھا رہی تھیں نیز عہد بربریت جس میں انسان زمین کی زرخیزی کو نہ صرف استعمال میں لا رہا تھا بلکہ اسے بڑھا بھی رہا تھا ہے تہذیب سے عاری کیوں ہے؟ ایسا لگتا ہے کہ یہاں تہذیب سے مراد عرفی معنوں میں مہذب ہونے سے ہے اور چونکہ گزشتہ دو ادوار وحشت اور بربریت کے دور کہلائے اس لیے انھیں تہذیب سے قبل کا دور کہا گیا۔۔سبطِ حسن نے اپنی کتاب ماضی کے مزار میں ان ادوار کے عنوانات مختلف بنائے تاہم انہیں انسانی تہذیب کے ادوار قرار دیا ہے اور تہذیب کو چار بڑے ادوار میں تقسیم کیا ہے:

۱۔ثمر یابی کا دور ۲۔شکار کا دور ۳۔گلہ بانی کا دور ۴۔زراعت کا آغاز

۱۔ ثمر یابی کے دور میں انسان جنگلی نباتات گھاس پات پر زندگی بسر کرتا تھا اس دور میں انسان اپنی خوراک خود پیدا کرنے پر قادر نہ تھا۔وہ قدرت پر انحصار کرتا تھا اور اس کا طرز زندگی جانوروں سے زیادہ مختلف نہ تھا۔

۲۔ اس دور میں قبیلہ تو بدستور برقرار ومضبوط تھا تاہم عورت کی حیثیت میں کمی ہوئی۔اب انسان پتھر کے نکیلے ٹکڑوں کو لکڑی سے جوڑ کر کلہاڑے اور بھالے بنانے لگا۔شکار جوکھم کا کام تھا اس لیے یہ مردوں کے سپرد ہوا اور عورتوں کی حیثیت ثانوی ہوگئی تاہم شکار کے باوجود نباتاتی اشیا کی تلاش عورت ہی کے سپرد تھی۔اس دور میں عورت نے پرورش و پرداخت اور افراد قبیلہ کی دیکھ بھال کی ذمہ داریاں احسن انداز میں سنبھال لی تھیں۔

۳۔ اس دور میں گلہ بانی کا آغاز ہوتا ہے۔دوران شکار جو جانور زندہ ہاتھ لگتے یا زخمی صورت میں مل جاتے ہیں انھیں قبیلے میں لے آتے، یوں گلہ بانی کا آغاز ہوا۔اس دور میں انسان کو شکار کی محتاجی سے نجات مل گئی اب اس کے پاس جانور موجود ہوتے تھے اگر وہ شکار پر نہ جاتا تو ان پالتو جانوروں کے گوشت سے لطف اندوز ہوتا۔اس دور میں وہ جانوروں کے دودھ سے بھی آشنا ہوا لیکن گلہ بانی کے اس دور میں انسان کو گھاس والے

علاقے تلاش کرنا پڑے اور وہ سفر کر کے ایسے علاقوں میں جا کر آباد ہوا۔

۴۔ گلہ بانی کے بعد کھیتا باڑی کا دور آیا زراعت کے بارے میں یہ اتفاق ہے کہ یہ فن عورتوں نے ایجاد کیا۔ زرعی دور کو عظیم دور کہا جا سکتا ہے کیوں کہ اب انسان کا زمین کے ساتھ مضبوط تعلق قائم ہوا اور اس نے سفری زندگی ترک کر کے حضری زندگی اختیار کی۔ عورت کو دوبارہ برتری نصیب ہوئی کیوں کہ زراعت میں عورت کا ہاتھ تھا۔ عورت پھر سے ایک فیصل قوت کے طور پر وجود میں آئی۔ اس دور کو اموی دور کہتے ہیں۔ اس دور میں وراثت اور حقوق وغیرہ کا تعین ماں کی طرف سے ہوتا تھا۔ بعض پسماندہ اقوام میں یہ نظام اب تک رائج ہے۔(۴)

سبطِ حسن اور اینگلز کا تفصیلی تقابل یہاں مقصود نہیں تاہم اینگلز کا عہدِ وحشت اور سبطِ حسن کا 'ثمر یابی کا دور' اور 'شکار کا دور' یکساں ہیں۔ اینگلز کا دوسرا دور عہدِ بربریت سبطِ حسن کے ہاں پھر دو ادوار میں تقسیم ہو جاتا ہے:

ا۔ یو گلہ بانی کا دور اور ۲۔ یو زراعت کا دور

اینگلز کے ہاں تیسرا دور جسے وہ تہذیب کا دور کہتے ہیں اور اس میں بالخصوص صنعت وحرفت کو بیان کرتے ہیں اسے سبطِ حسن نے بیان نہیں کیا۔ یوں اینگلز کے دو ادوار کو سبطِ حسن نے چار ادوار میں تقسیم کر دیا البتہ وہ صنعت کے دور کو جسے اینگلز یو تہذیب کا عہد کہتا ہے نہ جانے کیوں نظر انداز کر گئے۔

سجاد ظہیر نے روشنائی میں سماج کے جو ادوار گنوائے ہیں وہ ترقی پسند نظریے کی درست عکاسی کرتے ہیں۔ وہ اب تک کے سماج کو پانچ ادوار میں تقسیم کرتے ہیں:

ا۔ قدیم اشتراکی سماج ۲۔ غلامی ۳۔ جاگیرداری ۴۔ سرمایہ داری ۵۔ جدید اشتراکی سماج

سجاد ظہیر کے خیال میں یہ سماجی تبدیلی آلات واوزار کی تبدیلی سے خود بخود عمل میں آتی ہے۔(۵)

یہ ادوار باقاعدہ تہذیب کے ادوار کے اعتبار سے تو بیان نہیں کیے گئے تاہم چوں کہ تہذیب سماج سے الگ عمل نہیں اس لیے تہذیبی ادوار کو سمجھنے کے لیے سماج کے ان ادوار سے بھی مدد مل سکتی ہے۔

تہذیب وثقافت کے اجزائے ترکیبی:۔

دنیا کی تمام تہذیبیں چاہے وہ اس دور سے تعلق رکھنے والی ترقی یافتہ تہذیبیں ہوں یا ترقی پذیر یا ماضی کے اوراق میں گم ہو جانے والی تہذیبیں ہوں عموماً چار اجزائے ترکیبی پر مشتمل ہوتی ہیں۔ سبطِ حسن اپنی کتاب پاکستان میں تہذیب کا ارتقاء میں بیان کرتے ہیں:

دنیا کی ہر نئی پرانی تہذیب کی تشکیل چار عناصر ترکیبی سے مل کر ہوئی ہے۔

ا۔ طبعی حالات ۲۔ آلات واوزار ۳۔ نظامِ فکر واحساس

۴۔ سماجی اقدار اس میں نہ مشرق ومغرب کی تخصیص ہے نہ سرد وگرم علاقوں کی قید(۶) یہ تمام عناصر مل کر تہذیب کو جنم دیتے ہیں اور ان میں سے کسی کا غیاب ممکن نہیں۔ تاہم اثر کم یا زیادہ ہو سکتا ہے۔ اب ہم سبطِ حسن کے بیان کیے ہوئے ان عناصر کا مختصر طور پر جائزہ لیتی ہیں کہ وہ ان عناصر کی تفصیل میں کیا کہتے ہیں۔

طبعی حالات:۔

تہذیب کی تشکیل میں طبعی حالات کو بڑا دخل ہوتا ہے۔ ہر تہذیب کا اپنا ایک جغرافیہ ہوتا ہے اس کے دریا، پہاڑ، جنگل، میدان، پھل پھول، سبزیاں، چرند پرند، آب و ہوا اور موسم۔ اسے ہم خارجی ماحول کہتے ہیں اور یہ خارجی ماحول اس علاقے کے رہنے والوں کے رہن سہن، طرزِ عمل، خوراک و رہائش، ذریعہ معاش، اخلاق و عادات اور جذبات و احساسات پر گہرا اثر ڈالتا ہے اسی باعث ریگستانی علاقوں کی تہذیب پہاڑی علاقوں کی تہذیب سے مختلف ہوتی ہے۔ پانیوں کے کنارے بسنے والوں کی تہذیب میدانی علاقوں کے باسیوں سے الگ ہوتی ہے۔

یہ خاص حالات نہ صرف تہذیب کے نقوش ابھارتے ہیں بلکہ شخصیت پر گہرے اثرات مرتب کرتے ہیں۔ وہ بچے جو ناز و نعم سے پرورش پائیں ان بچوں سے مختلف ہوتے ہیں جو گندی بدبودار گلیوں میں ننگے بھوکے رہ کر پرورش پاتے ہیں اور جن کو طبی سہولتیں میسر نہیں ہوتیں۔ اس ضمن میں یہ بات اہم ہے کہ جہاں یہ طبعی ماحول انسان پر اثر انداز ہوتا ہے وہیں انسان بھی اس طبعی ماحول پر اثر انداز ہوتا ہے اور اسے بدلنے کی قدرت رکھتا ہے چنانچہ ترقی یافتہ قوموں کی صنعتی ترقی کے باعث اسی علاقے کا ایک ہزار سال پہلے کا باسی اگر پھر سے دنیا میں آئے تو اپنے علاقے کو پہچان نہ پائے۔

آلات و اوزار:۔

تہذیب انسانی کو مختلف ادوار میں تقسیم کرتے ہوئے دانایان تہذیب نے اسے پتھر، کانسے، اور لوہے کی تہذیب میں بھی تقسیم کیا ہے۔ پتھر کے دور کا انسان جو پتھر کے آلات و اوزار استعمال میں لاتا تھا اس کے رہن سہن، رسم و رواج اور فکر و احساس پتھر سے وابستہ اس مخصوص تہذیب سے برآمد ہوئے تھے۔ پھر جب کانسے کا دور آیا تو معاشرے کا ڈھانچہ ہی بدل گیا۔ دھات کے استعمال سے لوگوں میں مستقل رہائش کا رجحان پیدا ہوا کھیتی باڑی کا کلچر وجود میں آیا اور اسی اعتبار سے نئے پیشے اور ہنر وجود پذیر ہوئے۔ اور اس کے بعد جب لوہے کا دور آیا جس کی سختی مسلّم تھی تو انسان نے لوہے کی مدد سے مشینیں بنانا شروع کر دیں۔ اب اس کا ہل بھی زیادہ گہرائی تک جاتا تھا اور ٹوٹتا نہیں تھا۔ اس نے تہذیب کو نئی راہوں سے آشنا کیا اسی طرح بعد میں جب بڑی اور بھاری مشینیں بنیں اور صنعتی انقلاب آیا تو انسان ایک بالکل نئی تہذیب سے آشنا ہوا ٹریکٹر، اور دیگر زرعی مشینوں نے زراعت کے پورے کلچر کو تبدیل کر کے رکھ دیا اور کاشتکار اور زمیندار کے درمیان رشتے بھی از سرِ نو متعین ہوئے۔

نظام فکر و احساس:۔

انسان باشعور حیوان ہے چنانچہ انسانی شعور بھی زبان کی طرح ضرورتوں کے باعث نمو پاتا ہے اور یہ ضرورتیں انسانی سماج کی خصوصیت ہیں اس لیے سماج کے ارتقا سے شعور کا ارتقا اور شعور کے ارتقا سے سماج کا ارتقا لازم و ملزوم ہیں۔ شعور باقاعدہ فکر و احساس کے ایک نظام پر مشتمل ہوتا ہے۔ یہ فکر و احساس کا نظام اس دور کی ضرورتوں اور سماجی حالات سے جنم لیتا ہے اور پھر تہذیب اس نظام کے سائے میں پرورش پاتی ہے۔ ہر معاشرے کا نظام فکر و احساس سماجی شعور کے تابع ہوتا ہے اور یہ سماجی شعور سماجی حالات کے مطابق ہوتا ہے۔ سبطِ حسن لکھتے ہیں:

''ہمارے افکار و حساسات آسمان سے نہیں ٹپکتے اور نہ زمان و مکان کی قید سے آزاد ہوتے ہیں

بلکہ تہذیب کے دوسرے عوامل کی طرح سماجی حالات کی پیداوار ہوتے ہیں۔ دوسرے یہ کہ ہر
تہذیب کے نظامِ فکر و احساس میں وقتاً فوقتاً تبدیلیاں ہوتی رہتی ہیں اور ان تبدیلیوں کا باعث
سماجی حالات میں تغیرات ہیں۔"(۷)

عمومی طور پر نظامِ فکر مذہب پر مبنی ہوتا ہے تاہم سبطِ حسن چوں کہ مذہب کے الہامی نظریے کے قائل نہیں اس لیے وہ اسے مذہب کا نام نہیں دیتے بلکہ نظامِ فکر و احساس کہتے ہیں۔ مذہب کو الہامی ماننے والوں کے ہاں یہی نظامِ فکر و احساس، مذہب کے روپ میں جلوہ گر ہوتا ہے بلکہ ان میں سے کچھ مذہب پر ہی ثقافت کی بنیاد رکھتے ہیں۔ مذہب اور نظامِ فکر و احساس کی مماثلت میں تو کوئی ابہام نہیں ہے اور یہ ایک ہی فکر کا اظہار ہیں مسئلہ تو ان کے الہامی یا انسانی ہونے کا ہے۔ جس کا جی چاہے اسے مذہب سمجھ لے اور جس کا جی چاہے اسے مذہب سے ہٹ کر سمجھ لے تاہم یہ بات نظامِ فکر و احساس کو مذہب سے ممتاز کرتی ہے کہ ثقافت عالمی موضوع ہے اور ایسے علاقوں اور تہذیبوں کو بھی محیط ہے جو مذہب کے قائل نہیں ہیں۔ اس لیے سبطِ حسن کا مذہب کی جگہ اسے استعمال کرنا ثقافت کی علمی اور عالمی گفتگو کے حوالے سے اسے زیادہ وسعت دے دیتا ہے۔

سبطِ حسن نے مختلف ادوار کی مثالیں دے کر اس دور کے عقائد اور نظامِ فکر و احساس کا اس دور کے سماجی حالات اور سماجی تانے بانے سے تعلق بیان کیا ہے۔ جاگیرداری معاشرے میں جب ذاتی ملکیت کے نظریے کو فروغ ہوا تو عقائد و افکار میں جو تبدیلی ہوئی اس کو سبطِ حسن یوں بیان کرتے ہیں:

جب معاشرے میں طبقات قائم ہوئے اور ذاتی ملکیت نے رواج پایا اور معاشی اور سیاسی اقتدار مطلق العنان بادشاہوں، دربار کے امیروں اور پروہتوں کے ہاتھ میں آیا تو ان طبقوں نے اپنے معاشرتی نظام سے ملتا جلتا اور اس کے متوازی پوری کائنات کا ایک دیو مالائی نظام وضع کر لیا۔ تخلیقِ کائنات کے نئے نئے عقیدوں نے رواج پایا۔ جس طرح زمین پر بادشاہ کی مطلق العنان حکومت تھی اسی قسم کی مطلق العنان حکومت آسمان پر بھی قائم کی گئی۔ جس طرح زمین پر عام انسانوں کی زندگی اور موت بادشاہ کے اختیار میں تھی اور اس کی تقدیر کا فیصلہ حاکمِ وقت کرتا تھا اسی طرح کا اختیار کائنات کے قادرِ مطلق خدا......زیوس، رع، مردوک، بعل، اہورمزدا، ایشور وغیرہ سے منسوب کیا گیا۔ جزا سزا، دوزخ جنت، ملائکہ اور مقربین، شیاطین اور بھوت پریت، حساب و کتاب، حشر نشر، میزان اور عدالت غرض کہ افکار و عقائد کا ایک باقاعدہ نظام مرتب ہو گیا جو غور سے دیکھا جائے تو اس دور کی مطلق العنان بادشاہتوں کا ہو بہو چربہ نظر آئے گا۔(۸)

اس نظامِ فکر کی توجیہہ وہ یہ کرتے ہیں کہ انسان چوں کہ عالمِ موجودات کی سائنسی سوجھ بوجھ نہیں رکھتا تھا اس لیے اس نے کائنات کے نظام کو بھی اپنے سماجی نظام جیسا تصور کر کے ان عقائد کی بنیاد رکھی۔

سماجی اقدار:۔

کسی تہذیب کا ہے چوتھا جز و ترکیبی ہے جسے سبطِ حسن بیان کرتے ہیں۔ یہ اقدار نہ قانون کے ذریعے نافذ ہوتی ہیں نہ ان کے وضع کرنے میں کسی شوریٰ کا ہاتھ ہوتا ہے تاہم معاشرے کی صدیوں کی زندگی بہت خاموشی کے ساتھ ان کی تشکیل کرتی ہے اور ان کے پیچھے اس معاشرے کی کسب و جہد اور جمالیاتی ذوق کارفرما ہوتا ہے۔ یہ سماجی اقدار معاشرہ

خود ہی تشکیل دیتا ہے اور پھر خود ہی ان کی پابندی کرتا ہے۔ قبائلی زندگی میں ہے اقدار زیادہ مستحکم ہوتی ہیں اور ان سے منحرف ہونے والے قبیلے سے خارج کر دیے جاتے ہیں۔ ان میں بعض اوقات بڑی عجیب اور ناقابل قبول اقدار بھی ہوتی ہیں جن کی کوئی عقلی دلیل نہیں دی جاسکتی پھر بھی ان کی پیروی میں تساہل برداشت نہیں کیا جاتا۔ جیسے اگر قبیلہ کہے کہ بیوی کو طلاق دے دوتو وہ آدمی انکار نہیں کرسکتا۔ یا قتل کے عوض میں اگر مقتول کا وارث قتل کرنے سے پہلو تہی کرے تو اسے قبیلے والے بزدل قرار دے کر اس کی توہین کرتے ہیں۔

بعض لوگ خیال کرتے ہیں کہ ہے اقدار بھی آسمانی ہوتی ہیں یا کسی مصلح کی نافذ کی ہوئی ہوتی ہیں جب کہ سبطِ حسن کہتے ہیں کہ ایسا نہیں ہے۔ صرف اتنا ہے کہ مصلح ان میں سے بعض کو قبول اور بعض کو رد کرتا ہے۔ بعض سماجی اقدار ایک وقت میں رائج تمام تہذیبوں میں مشترک ہوتی ہیں اور بعض کسی معاشرہ کی انفرادی خصوصیت ہوتی ہیں۔ جیسے گوشت کھانے کے حوالے سے مختلف قوموں کی مختلف اقدار، یا لباس کے حوالے سے ایک صورت کہیں پسندیدہ ہے اور کہیں معیوب اور بعض قبائل آج بھی لباس سے بے نیاز ہیں۔ بعض تہذیبیں ایک سے زائد بیویوں کی حوصلہ افزائی کرتی ہیں اور بعض ممنوع قرار دیتی ہیں۔ سماجی اقدار غیر مبدل نہیں ہوتیں وقت کے ساتھ ساتھ ان کی بہتری اور تبدیلی کا عمل چلتا رہتا ہے جیسے کسی دور میں فربہ عورتیں حسین تصور ہوتی تھیں لیکن آج فربہی عیب ہے اس میں ایک بات اور بھی محل غور ہے کہ معاشرے کے امیر اور غریب طبقے میں سماجی اقدار کا حسن وقبح یکساں نہیں ہوتا۔ امیر طبقہ اپنے لیے بہت سی ایسی چیزوں کو روا سمجھتا اور ان پہ عامل ہوتا ہے جس کے اگر غریب مرتکب ہوں تو موجب سزا ہوں۔ (۹)

اس فکر کی رو سے بدلتے حالات کے تقاضے بھی نئے ہوتے ہیں اس لیے نئے دور کے تقاضوں کے تحت انسان کو زندگی کرنے کے نئے انداز سے آشنا ہونا پڑتا ہے اگر وہ اس میں رکاوٹ بنتا ہے تو یہ سیل اسے خس وخاشاک کی طرح بہا لے جاتا ہے۔ سبطِ حسن اور دیگر ترقی پسند نظریات کے حامل ثقافتی دانشور اس معاملے میں طرزِ کہن پہ اڑنے کی بجائے اس بات کے پرچارک ہیں کہ بدلتے حالات اور تاریخ کا بہا؟ تہذیب وثقافت میں نیا خون خود ہی شامل کرتے رہتے ہیں جس سے وہ ہر دم جواں رہتی ہے بس اسے فطری رفتار سے آگے بڑھنے سے روکنا نہیں چاہیے۔ اس کے ترکیبی عناصر جدلیاتی اصول کے تحت نیا ثقافتی خاکہ مرتب کرتے رہتے ہیں جیسے زراعت کے دور سے صنعت کے دور کی تہذیب کے نئے تقاضے اور جیسے پتھر، لوہے اور کانسے کے دور میں تہذیبی تبدیلیاں جن کو انسان روکنا بھی چاہے تو نہیں روک سکتا۔ تاہم ان تبدیلیوں کو بے مہار نہیں سمجھنا چاہیے بلکہ یہ ترکیبی عناصر سے متشکل ہوتی ہیں اور ترکیبی عناصر میں جغرافیے اور آلات واوزار کے ساتھ ساتھ نظامِ فکر واحساس اور سماجی اقدار بھی شامل ہیں جو اس قوم کے اجتماعی شعور سے وجود میں آتی ہیں اس لیے وہ نہ تو الہامی ہوتی ہیں نہ معاشرے سے بے نیاز بلکہ ان کی پیدائش عین فطرت کے اصولوں کے تحت ہوتی ہے۔

سجاد ظہیر اور ممتاز حسین جیسے لوگ سبطِ حسن سے پہلے نظامِ فکر واحساس پر سبطِ حسن جیسے خیالات کا اظہار کر چکے ہیں۔ سبطِ حسن نے اسی اندازِ فکر کو تفصیلی تحقیقی بنیاد فراہم کی۔ سجاد ظہیر نے ثقافت کے ترکیبی عناصر پر تفصیلی اظہار خیال نہیں کیا تھا نیز انھوں نے برصغیر کے تہذیبی خاکے میں تبدیلی کا جائزہ لیتے ہوئے نظامِ فکر واحساس پر بھی جزوی اظہارِ خیال کیا تھا اسے باقاعدہ نظامِ فکر کی صورت میں پیش نہیں کیا تھا۔ سجاد ظہیر لکھتے ہیں:

''خیالات، نظریے اور عقیدے انسانوں کے دماغ میں نہ خودرو ہوتے ہیں اور نہ آسمانوں سے نازل ہوتے ہیں۔ مادی حالاتِ زندگی یعنی وہ وسیلے اور طریقے، وہ آلات اور ذرائع پیداوار اور رسل و رسائل جنھیں استعمال کر کے انسانوں کے گروہ اپنے کھانے پینے اور رہنے سہنے کے وسائل حاصل کرتے ہیں۔ انسانی معاشرے کی شکل و صورت متعین کرتے ہیں۔'' (۱۰)

سبطِ حسن فکری اساس میں سجاد ظہیر اور ممتاز حسین کے قریب نظر آتے ہیں۔ اعتقادات اور فکری اساس کے تعین میں وہ اپنے ہم عصر ترقی پسندوں میں سے فیض احمد فیض اور احمد ندیم قاسمی کی طرح تہذیب کی آسمانی اساس کو اپنے نظامِ خیال میں جگہ نہیں دیتے بلکہ خالص اشتراکی نقطۂ نظر سے سارے معاملے کو دیکھتے ہیں۔ سجاد ظہیر کے محولہ بالا اقتباس کو دیکھ کر تو ایسا محسوس ہوتا ہے جیسے سبطِ حسن نے بیشتر لفظ بھی سجاد ظہیر کے استعمال کیے ہیں۔ حوالہ نمبر ے اور سجاد ظہیر کی مندرجہ بالا عبارت میں تھوڑا بہت لفظی ردّ و بدل تو ہے تاہم فکری دوئی نہیں۔ سجاد ظہیر نے اشتراکی نظریات پر جس ثقافتی نظریے کی بنیاد رکھی تھی سبطِ حسن نے اپنی فکری اپج سے اسے باقاعدہ نظامِ فکر کا روپ دے دیا ہے۔ اب اس ضمن میں ممتاز حسین کو دیکھیے۔ ممتاز حسین کے خیال میں تہذیبی پستی اور معاشی بدحالی کو موضوع بناتے ہوئے عمومی طور پر مسلمانوں کے زوال کا سبب مذہب سے دوری کو بتایا جاتا ہے اور پھر شد و مد سے مذہب کی طرف مراجعت کی تحریکیں شروع ہوتی ہیں اور یہ گمان کر لیا جاتا ہے کہ اب مسلمان تہذیبی انحطاط سے نکل کر دنیا کے شانہ بشانہ ہو جائیں گے بلکہ دنیا ان کی پیروی میں فخر محسوس کرے گی۔ لیکن اس ساری سوچ میں معروضیت کا عنصر شامل نہیں۔ تہذیبی عروج جن مادی بنیادوں پر استوار ہوتا ہے ان کی طرف دھیان نہیں۔ لکھتے ہیں:

''ہم جو یورپ کے غلام ہوئے تو اس کا سبب یہ نہ تھا کہ ہم میں قرونِ اولیٰ کا کریکٹر نہ تھا اور ہم بے دین ہو گئے تھے۔ امریکہ جو ہمارے دین و ایمان کا محافظ ہے وہ کب اپنے مذہب سے قریب تر ہے بلکہ اس کا سبب یہ تھا کہ بھاپ اور بجلی کی ایک نئی طاقت جو یورپ کی صنعتی زندگی میں انقلاب لائی اس سے ہم محروم تھے۔'' (۱۱)

گویا ممتاز حسین کے نزدیک عروج و زوال کی داستان میں مذہب نہیں بلکہ مادیت کی اہمیت ہوتی ہے اگر قوم مادی اعتبار سے ترقی یافتہ ہے تو زوال اس کا مقدر نہیں چاہے مذہب فراموش ہو گیا ہو اور مذہب کو الہامی حیثیت میں ان تہذیبی مفکرین نے قبول نہیں کیا۔ یہ کہنا بجا ہو گا کہ سبطِ حسن، سجاد ظہیر اور ممتاز حسین تینوں ثقافت کے ترقی پسندانہ نظریے کے پرچارک ہیں اور ان کے خیالات ثقافت کے ضمن میں یکساں ہیں۔ ان نظریات کی بنیاد مذہب کو انسانی ذہن کی ارفع فعالیت سمجھنے پر ہے الہامی سمجھنے پر نہیں، اسی لیے یہ نظریہ پاکستان جیسے اسلامی نظریاتی ملک میں قبولِ عام نہ حاصل کر سکا کیوں کہ اس پر مذہب کے حوالے سے جو بہت بڑا سوالیہ نشان لگتا ہے وہ کسی طرح حل نہیں ہو سکتا اور اشتراکیت جس پر اس نظریے کی بنیاد تھی دنیا سے اپنی بساط تقریباً لپیٹ چکی ہے اس لیے اس نظریے کو قابلِ قبول بنانے میں فیض احمد فیض، احمد ندیم قاسمی اور کسی حد تک سجاد باقر رضوی نے بنیادی کام کیا۔

فیض احمد فیض ترقی پسند تہذیبی نقاد ہیں تاہم وہ ثقافتی و تہذیبی معاملات میں مذہب کو نظر انداز نہیں کرتے۔ مذہب کی ثقافتی اہمیت اور برِصغیر کی تہذیبی تاریخ کو مدِنظر رکھتے ہوئے وہ پاکستانی ثقافت کا جو خاکہ بیان کرتے ہیں وہ

حقائق پر مبنی ہے اور اس میں مذہب سے صرفِ نظر نہیں ہے۔ فیض کہتے ہیں:

''ذاتی طور پر میں یہ سمجھتا ہوں کہ چونکہ ہماری تہذیب میں یہ دونوں عناصر شامل ہیں یعنی ایک طرف ہماری وطنیت اور دوسری طرف ہمارا دین۔ اس لیے ہماری تاریخ پانچ ہزار سال پرانی ٹھہرے گی۔ ہر چند کہ اس میں تین یا چار ہزار سال کی تہذیب ہندوستان کے ساتھ مشترک ہے اور اس کی تہذیبی روایات ہندوستان کے ساتھ منسلک ہیں لیکن اس میں ایک حصہ ایسا ہے جو کہ ہندوستان کے ساتھ مشترک نہیں ہے یا ہندوستان کے غیر مسلموں کے ساتھ مشترک نہیں ہے وہ ایک ہزار سال کا حصہ ہے جو کہ اسلامی دور کا حصہ ہے۔ اس دور کی جو تہذیبی روایات ہیں اس کا فن اس کے عقائد، اس کے رہنے سہنے کے طریقے، اس کے رسم و رواج وہ غیر مسلموں کے اور ہندوستانیوں کی تہذیبی روایتوں سے قطعی مختلف ہیں چنانچہ یہ چیز ہم کو ہندوستان سے ممیّز کرتی ہے۔ دوسری طرف ہماری پہلی چار ہزار سال کی تاریخ ہے یہ ہم میں اور باقی اسلامی ممالک میں مشترک نہیں ہے...... دونوں چیزیں مل کے ایک خصوصی چیز پیدا ہوتی ہے، ایک انفرادی چیز پیدا ہوتی ہے جس کو ہم پاکستان کی تہذیبی شخصیت کہتے ہیں۔''(۱۲)

احمد ندیم قاسمی اگرچہ ترقی پسند خیالات کے حامل ہیں تاہم وہ جغرافیے اور تاریخ کے ساتھ ساتھ مذہب کے اثرات کے بھی قائل ہیں۔ لکھتے ہیں:

''ہر تہذیب میں اس مٹی کی بو باس ضرور آ جاتی ہے جہاں وہ تہذیب پیدا ہوئی، پھیلی، پنپی اور بدلی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ جتنے بھی اسلامی ممالک اس وقت کرہ ارض پر موجود ہیں ان کی تہذیبیں اگر بعض بنیادی امور میں مماثل ہیں تو بعض تفاصیل میں مختلف بھی ہیں۔''(۱۳)

سجاد باقر رضوی ثقافت کے اجزائے ترکیبی کا ایک منفرد اور اچھوتا نظریہ پیش کرتے ہیں اس نظریے کی جامعیت ملاحظہ کیجیے۔ رضوی لکھتے ہیں:

''انسان کی تخلیقی زندگی میں دو اصول کارفرما ہوتے ہیں۔ پہلا اصول جذبات و جبلتوں کا تخلیقی اصول ہے جس کا مقصد تخلیق ہے اور دوسرا اصول تہذیب کی وہ شعوری دنیا ہے جو انسانی زندگی کے لیے رہنما اصول فراہم کرتی ہے۔ اب آپ تخلیقی اصول کو مادری اصولِ زندگی کہہ لیجیے اور تنظیمی اور رہنما اصول کو پدری اصول زندگی کہہ لیجیے۔ یہ پدری اصول زندگی مادری اصول زندگی سے مل کر تخلیق کا ذریعہ بنتا ہے۔''(۱۴)

یہاں پدری اصول سے رضوی صاحب کی مراد مذہب ہے اور مادری اصول سے مراد جغرافیہ اور فطرت ہے۔ ان چند مفکرین کے مختصر خیالات محض اس لیے پیش کیے گئے ہیں کہ ترقی پسند فکر یا اس فکر سے نزدیکی رکھنے والے مفکرین کا سطحِ حسن سے تھوڑا سا تقابل کر لیا جائے۔

پاکستانی ثقافت:۔

سبطِ حسن کے مباحث کا بڑا دائرہ پاکستانی ثقافت کے ارتقا اور تشکیل کے مباحث پر محیط ہے۔ ہر علاقے کی اپنی ثقافت ہوتی ہے اور ہر قوم کی اپنی ایک تہذیب جو دوسری اقوام اور علاقوں سے انفرادیت کے باعث اپنی پہچان رکھتی ہے لیکن کوئی بھی تہذیب و ثقافت اپنے تمام کوائف میں کسی دوسری تہذیب سے مختلف نہیں ہوتی۔ تہذیبوں کا موازنہ کیا جائے تو ان میں بہت سی مماثلتیں اور اشتراکات تلاش کیے جاسکتے ہیں جن کا کوئی نہ کوئی سبب بھی لازمی ہوتا ہے جیسے مشترک جغرافیہ، مشترک تاریخ، مشترک مذہب، مشترک زبان وغیرہ۔

کلچر کے دائرے جو فرد سے شروع ہو کر زمین (جو کہ اس عظیم کائنات کا ایک ننھا سا ذرّہ ہے) تک پھیلتے چلے جاتے ہیں ان میں جہاں انفرادیت نمایاں ہوتی ہے وہیں دنیا کے باسی ہونے کے ناطے کچھ مماثلتیں اور اشتراکات بھی تلاش کیے جاسکتے ہیں چاہے زمینی بُعد ہو، جغرافیہ مختلف ہو، تاریخ جدا ہو، مذہبی اختلاف ہو یا نسلی اشتراک ناپید ہو۔ تہذیب و ثقافت کا طالب علم انسانوں میں منافرت کی خلیج کے ساتھ ساتھ تہذیبی اشتراکات پر متحیر ہوتا ہے۔

ان حالات میں ایک چھوٹے سے خطے کی تہذیبی انفرادیت کی تلاش خاصا مشکل کام ہے لیکن ایک قوم ہونے کے ناطے پاکستانی تہذیب کی تلاش و نفاذ ہماری قومی ذمہ داری ہے جس سے ہم اپنا امتیاز پیدا کرسکیں۔ پاکستان تاریخ کے ایک مختصر یا طویل عمل کی پیداوار تھا۔ اسے جنگ آزادی سے آغاز کریں، مغلوں کے دور حکومت سے یا برصغیر میں مسلمانوں کی آمد سے بہر حال ایک نیا ملک اپنی الگ سیاسی حد بندیوں کے ساتھ برصغیر کی جغرافیائی اکائی پر نمودار ہوا اور خود ایک اکائی بن گیا۔ اس نئی حد بندی سے قبل پورا برصغیر جغرافیائی طور پر ایک اکائی سمجھا جاتا تھا۔ لوگ بے روک ٹوک کراچی کے ساحل اور بلوچستان سے مدراس اور کلکتہ تک جاتے تھے ان کے ثقافتی روابط وسیع تھے پاکستان بننے کے بعد یہ روابط محدود ہو گئے اب واہگہ ان کی پہنچ میں تھا اور واہگہ سے پار کا امرتسر ایک اجنبی دنیا۔ چنانچہ انسان کی تگ و تاز چاہے وہ تجارت کے حوالے سے ہو یا مذہبی تبلیغ کے حوالے سے، سیاسی حوالے سے ہو یا ملازمت کے حوالے سے، محدود ہو کر رہ گئی۔

اب قدرتی طور پر اس محدد علاقے کے لوگ جو ایک اکائی کی صورت وجود پذیر ہوئے تھے ایک دوسرے کے قریب آ گئے کیوں کہ ان کا سیاسی مرکز مشترک تھا چنانچہ ایک نئے کلچر کے فروغ کے امکانات پیدا ہوئے کیوں کہ کلچر کے دائرے اب ایک نئے اور قدرے مختصر روپ میں وجود میں آئے۔ نئے کلچر کیفروغ کے امکانات اس طرح سے کہ اگرچہ تہذیبی میراث تو وہی تھی جو سارے برصغیر کی تھی تاہم اب داخلی طور پر نئے نظریات (جو تحریک پاکستان کے دوران میں متشکل ہوئے) نئے روابط اور نئے مسائل درپیش تھے اور بالخصوص اس حوالے سے کہ اب یہ معاشرہ کثیر المذہبی نہ تھا بلکہ اکثریت ایک مذہب کے ماننے والوں کی اور ایک قلیل سی اقلیت دیگر چند مذاہب کی، جو بہر طور تہذیب پر اثر انداز ہونے کے اہل نہیں تھے سو یہ محض ایک سیاسی تقسیم نہیں تھی بلکہ ایک نئی تہذیبی و ثقافتی اکائی کا جنم تھا اسی لیے قیام پاکستان کیبعد پاکستانی ثقافت کا سوال اہل فکر و دانش نے قائم کیا۔ تاہم ترقی پسند مفکرین کے خیال میں اس کی ضرورت ہی نہ تھی کیوں کہ وہ قوم کے تصور میں اختلاف رکھتے تھے اور یہ بھی کہ ثقافت کے لیے ماضی کی طرف لوٹنا ضروری نہیں ہوتا بلکہ ماضی کی جن اقدار میں وقت کا ساتھ دینے کی اہلیت ہوتی ہے وہ زندہ رہتی ہیں اور جو وقت کا ساتھ نہ دے سکیں انہیں زبردستی زندہ نہیں کرنا چاہیے۔

سبطِ حسن اپنے ایک مضمون میں پاکستانی تہذیب کی تلاش کے جواز کی توجیہہ یوں کرتے ہیں:

''پاکستانی تہذیب کی تلاش اس مفروضے پر مبنی ہے کہ چوں کہ ہر ریاست قومی ریاست ہوتی ہے اور ہر قومی ریاست کی اپنی انفرادی تہذیب ہوتی ہے لہٰذا پاکستان کی بھی ایک قومی تہذیب ہے یا ہونی چاہیے۔''(۱۵)

لیکن سبطِ حسن ریاست اور قوم کے فرق کو بیان کرتے ہوئے اس مفروضے کو بنیاد سے محروم کر دیتے ہیں ان کے خیال میں ریاست ایک جغرافیائی یا سیاسی حقیقت ہوتی ہے اور قوم یا قومی تہذیب ایک سماجی حقیقت۔ چنانچہ یہ ضروری نہیں کہ ریاست اور قوم کی سرحدیں ایک ہوں۔ مثلاً جرمن قوم جو دو آزاد ریاستوں میں منقسم ہے، یا کوریا اور ویت نام۔ مگر جب ہم قومی تہذیب کی بات کریں گے تو مشرقی اور مغربی جرمنی، شمالی اور جنوبی کوریا اور شمالی اور جنوبی ویت نام کو ایک وحدت ماننا ہوگا۔ اسی طرح ریاست کے حدود بدلتے رہتے ہیں جیسے پاکستان کے حدود اب وہ نہیں جو ۱۹۴۷ء میں تھے۔ لیکن قوم کے حدود بہت مشکل سے بدلتے ہیں۔ تیسری بات ہے کہ بعض ریاستوں میں ایک ہی قوم آباد ہوتی ہے جیسے جاپان، اٹلی، فرانس وغیرہ۔ ایسی ریاستیں، قومی ریاستیں کہلاتی ہیں لیکن بعض ریاستوں میں ایک سے زائد قومیں آباد ہوتی ہیں، جیسے کینیڈا میں برطانوی اور فرانسیسی، چیکوسلواکیہ میں چیک اور سلاف، عراق میں عرب اور کرد وغیرہ۔ اس لیے جن ملکوں میں ایک ہی قوم آباد ہوتی ہے وہاں ریاستی تہذیب اور قومی تہذیب یکساں ہوتی ہے لیکن جہاں ایک سے زائد قومیں ہوں وہاں مختلف آباد قوموں کے باہمی تعامل پر اس کا دارومدار ہوتا ہے۔ اگر اتفاق کی قوتیں فروغ پائیں تو ایک بین الاقوامی تہذیب نمو پا جاتی ہے اگر نفاق کا معاملہ ہو تو ایک ریاستی تہذیب کے فروغ کے امکانات معدوم ہوتے ہیں۔(۱۶)

سبطِ حسن کی بات درست ہے کہ یہاں قوم کا تصور ایک بحث کو جنم دیتا ہے تاہم نفاق کی بجائے اتفاق کی قوتوں کے فروغ سے تہذیبی نمو کے امکانات کا جائزہ لیا جا سکتا ہے اور بالخصوص یہ کہ جہاں نوے فی صد سے زائد آبادی ایک مذہب (نظامِ فکر و احساس) سے تعلق رکھتی ہو، چاہے لسانی اختلاف ہی ہو ان میں مذہب ایک مشترک عامل کے طور پر موجود ہے جو انھیں ایک قوم کی شکل دیتا ہے اس لیے پاکستان میں رہنے والے ایک قوم ہیں اور قائداعظم کے فرمان کے مطابق:

''ہم سب شہری ہیں اور ایک ملک کیا کساں شہری ہیں۔ میں سمجھتا ہوں اب ہمیں اس بات کو نصب العین کے طور پر اپنے پیشِ نظر رکھنا چاہیے پھر آپ دیکھیں گے کہ جیسے جیسے زمانہ گزرتا جائے گا نہ ہندو، ہندو رہے گا، نہ مسلمان، مسلمان۔ مذہبی اعتبار سے نہیں کیوں کہ یہ ذاتی عقیدے کا معاملہ ہے بلکہ سیاسی اعتبار سے اور ملک کے شہری کی حیثیت سے۔''(۱۷)

یہ صرف مسلمان ہی نہیں، دیگر مذاہب سے تعلق رکھنے والے بھی پاکستانی قوم کے افراد ہیں جن کیا ستعمال میں آنے والے آلات و اوزار یکساں ہیں، طبعی حالات ایک سے ہیں، نظامِ فکر و احساس بیشتر آبادی کا یکساں ہے، اور سماجی اقدار کے معاملے میں وہ تاریخی وادیِ سندھ سے تعلق رکھنے کے باعث ایک دوسرے کے بہت قریب ہیں تو یہ سب عناصر انھیں ایک تہذیب کی لڑی میں پرو سکتے ہیں۔ اس سلسلے میں پاکستانی ثقافت کی دریافت اور ارتقا اربابِ اختیار کے ساتھ ساتھ پوری قوم کی اور بالخصوص موثر طبقوں کی ذمہ داری ہے۔ سبطِ حسن کا ایک مضمون 'ہم اور ہماری تہذیب' کے عنوان سے ہے اس میں وہ پاکستانیوں کا ایک قوم ہونا تسلیم کرتے ہیں تاہم وہ اس قوم کی تہذیبی صورتِ حال پر تفکر کا اظہار کرتے ہیں کہ

پاکستان میں اس حوالے سے کاوش نہیں ہوتی۔ شہروں کی حد تک ایک مخصوص موسم میں چند ادبی تقریبات اور نمائشیں وغیرہ منعقد کر کے اس اہم ذمہ داری سے سبک دوش نہیں ہوا جا سکتا بلکہ اس کا دائرہ دیہاتوں تک پھیلانا ضروری ہے کیوں کہ بیشتر آبادی دیہات سے منسلک ہے۔ اسی طرح شہریوں کو دیہات کی زندگی کے صحت مند پہلو؟ ں سے روشناس کرانا چاہیے اور تہذیب کے مختلف مظاہر کے درمیان ربط پیدا کرنا بھی ضروری ہے تا کہ قومی کلچر ایک وحدت کی صورت میں ترقی کر سکے اور ہم تہذیبی و ثقافتی اعتبار سے ایک قوم بن سکیں۔ (۱۸)

حوالہ جات

۱۔ سبطِ حسن، پاکستان میں تہذیب کا ارتقا، (کراچی: دانیال، ۱۹۸۶)، ص ۱۳

۲۔ سبطِ حسن، تہذیب سے تمدن تک، مشمولہ: کلچر، (لاہور: بیت الحکمت، ۲۰۰۷ء)، مرتب: اشتیاق احمد، ص ۱۳۲

۳۔ فریڈرک اینگلز، خاندان، ذاتی ملکیت اور ریاست کا آغاز، (لاہور: بک ہوم ۲۰۱۰ء)، ص ۲۸

۴۔ سبطِ حسن، ماضی کے مزار، (کراچی: دانیال، ۱۹۸۶ء)، ص ۵۶۔۵۸

۵۔ سجاد ظہیر، روشنائی، (دہلی: قومی کونسل برائے فروغِ اردو زبان، س۔ن)، مرتبہ: نجمہ ظہیر باقر علی باقر، ص ۴۱

۶۔ سبطِ حسن، پاکستان میں تہذیب کا ارتقا، ص ۲۵

۷۔ ایضاً، ص ۳۸

۸۔ ایضاً، ص ۳۶۔۳۷

۹۔ ایضاً، ص ۴۰۔۴۷

۱۰۔ سجاد ظہیر، روشنائی، ص ۳۹

۱۱۔ ممتاز حسین، ہمارا کلچر اور ادب، مشمولہ: کلچر، ص ۵۰

۱۲۔ فیض احمد فیض، پاکستانی کلچر اور قومی تشخص کی تلاش، (لاہور: فیروز سنز، ۱۹۸۸ء)، ص ۳۴

۱۳۔ احمد ندیم قاسمی، پاکستانی تہذیب کی صورت پذیری، مشمولہ: کلچر، ص ۱۱۲

۱۴۔ سجاد باقر رضوی، تہذیب و تخلیق، (اسلام آباد: مقتدرہ قومی زبان، ۱۹۸۷ء)، ص ۶۸۔۶۹

۱۵۔ سبطِ حسن، تہذیب کیا ہے، مشمولہ: پاکستانی ثقافت، (اسلام آباد: اکادمی ادبیات، ۱۹۹۹ء)، مرتبہ: ڈاکٹر رشید امجد، ص ۳۵

۱۶۔ ایضاً، ص ۳۵۔۳۶

۱۷۔ محمد علی جناح، بحوالہ: پاکستان کے فکری بحران، از: ڈاکٹر وحید قریشی، (لاہور: مغربی پاکستان اردو اکیڈمی، س۔ن)، ص ۸۶۔۸۷

۱۸۔ سبطِ حسن، پاکستان کے تہذیبی و سیاسی مسائل، (کراچی: مکتبہ دانیال، ۲۰۱۵ء)، ص ۲۶۹